عبدالمجید قریشی مرحوم

کاروانِ خطابت کا آخری نقیب

یہ منزلت بھی غنیمت ہے اہلِ دنیا کی
ملا کے خاک میں ذکرِ کمال کرتے ہیں

بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں میں سے ایک کہانی یوں شروع ہوتی تھی کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کی ایک بیٹی تھی۔ نہایت حسین و خوش جمال۔ شہزادی کے حسن کا یہ عالم تھا کہ ہنستی تھی تو پھول برستے تھے۔ اور روتی تھی تو موتی جھڑتے تھے۔ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں میں آگے چل کر مجھے کچھ ایسے ہی حسین و جمیل مناظر دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ ان کی تقریریں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے یہ شعر شاید ان ہی کی سحر بیانی اور طلاقت لسانی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

شبنم کہیں گرائی، کہیں گُل کھلا دیا
رویا کہیں کوئی تو کسی کو ہنسا دیا

انگریزی زبان میں مقرر کے لئے عام طور پر لیکچرر اور سپیکر کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جہاں حضرت شاہ جی مرحوم و مغفور کی خطابت کا ذکر مقصود ہو گا وہاں ہمیں ان کے لئے انگریزی لغت سے لفظ (ORATOR) کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ان کی تقریریں بلاشبہ فصاحت و بلاغت کا ایک نادر اور بے مثال مرقع ہوتی تھیں۔ وہ جو مرزا غالب نے فرمایا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

تو خدا ہی جانے کن کے لئے فرمایا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب شاہ جی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سلاست و روانی اور برجستگی بے اختیار ان کی زبان کے بوسے لیتی ہوئی نظر آتی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس قومی کاروانِ خطابت کے آخری نقیب تھے جس کے سالارِ اول نواب محسن الملک مرحوم تھے۔ نواب صاحبؒ کا شمار اپنے دور کے بہترین مقررین میں ہوتا تھا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں اپنے سامعین پر اتنا ہی اختیار ہوتا تھا جتنا اختیار ایک کمہار کو مٹی پر ہوتا ہے۔ یہ کمہار کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ گندھی ہوئی مٹی کو جس شکل میں چاہے تبدیل کر دے۔ اسی دور کے ایک بلند پایہ خطیب شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی بھی تھے۔ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں کی بھی دنیائے خطابت میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجتماعات ہوں یا انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے ڈپٹی صاحب خصوصی طور پر ان میں مدعو کئے جاتے۔ ان کے بغیر قوم کی ان محفلوں کا رنگ نہ نکھرتا اور لوگ جب تک ان کو سن نہ لیتے بے کیفی سی محسوس کرتے رہتے۔

شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کی وفات (۱۹۱۲ء) کے وقت برصغیر کے سیاسی مسائل میں دور رس تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما جو ابھی کل تک حکومت وقت سے وفاداری بشرط استواری کی پالیسی پر گامزن تھے۔ رفتہ رفتہ اب اس راہ سے ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ اور حکمرانوں کو آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ بلکہ مولانا حسرت موہانی تو اب سے کوئی چار پانچ سال قبل ہی اپنے ماہنامے "اردوئے معلیٰ" میں شائع کردہ ایک مضمون کی بناء پر بہ جرم بغاوت حوالۂ زنداں کئے جا چکے تھے۔ برصغیر کے عوام اب بادۂ حریت سے سرشار ہو چکے تھے۔ اور اس نشے کا اتارنا کسی ترشی کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اس وقت گلستان خطابت میں جیسے فصلِ بہار آ گئی تھی۔ مسلمانوں کے نوجوان طبقے میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان میدانِ خطابت میں ابھرے اور بڑی شان کے ساتھ ابھرے۔ ان کے ذرا بعد آنے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر کے ایم اشرف، مولانا محمد داؤد غزنوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے۔ ان حضرات کے میدان ہائے عمل مختلف تھے مگر مطمح نظر ایک ہی تھا۔ اور وہ تھا حصول آزادیِ وطن۔ حضرت شاہ جی کا اسم گرامی میں "ترکش مارا خدنگ آخریں" کے طور پر آخر میں لے رہا ہوں ورنہ جہاں تک ان کی شخصیت اور فن کا تعلق ہے۔ وہ ہمیں ہر جگہ ممتاز، یکتا اور منفرد نظر آتے ہیں۔ حقیقت میں وہ فن خطابت کے امام تھے۔ جن لوگوں کو "الف لیلہ" پڑھنے یا سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس کتاب میں کس طرح ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی انداز شاہ جی مرحوم کی خطابت کا تھا گو وہ اپنی تقریر کے بہاؤ میں نفس مضمون سے کوسوں دور نکل جاتے تھے لیکن ان کی تقریر کی دلکشی و دلربائی کی یہ کیفیت ہوتی کہ بعض دفعہ عشاء سے فجر ہو جاتی تھی نہ کوئی اکتاتا اور نہ کسی آنکھ میں نیند آتی۔ قرآن کریم کی تلاوت کا ان کا اپنا لب و لہجہ تھا۔ یہ فریضہ وہ بڑے سوز و گداز کے ساتھ انجام دیتے۔ ایک ہندو دوست نے کیا ہی خوب کہا کہ قرآن کو معجزے کے طور پر دیکھنا ہو تو سید عطاء اللہ شاہ کو آیات قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھو!

شاہ جی کی تقریر میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں قیام دلی کے دوران میں سنی۔ پہاڑ گنج میں تانگوں کے اڈے کے برابر ایک بڑا سا گول میدان ہوا کرتا تھا۔ جسے گول چکر کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ ہمیشہ جلسہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مجھے شاہ جی کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا پہلے پہل یہیں اتفاق ہوا تھا۔ وہ منظر اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

ان دنوں برسات کا موسم تھا۔ گیارہ بجے شب کے قریب جب حضرت شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو آسمان پر دور دور تک سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تقریر کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ پانچ سات منٹ بعد یہ پھوار ننھی منی بوندوں میں تبدیل ہو گئی۔ موسم کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر سامعین کچھ کسمسائے لیکن اٹھے نہیں۔ اور شاہ جی کی تقریر جاری رہی۔ گو بوندیں ان کے اوپر بھی گر رہی تھیں۔ لیکن وہ تقریر کے ساتھ ساتھ حاضرین کی ذہنی کشمکش کا لطف اٹھانے پر تلے ہوئے تھے۔ بارش ہلکے پھلکے انداز میں

جاری تھی کہ دو آدمی اٹھنے لگے۔ انہیں اٹھتا ہوا دیکھ کر شاہ جی جوش میں آگئے فرمانے لگے! "دلی والو! بس اتنے ہی مرد ہو کہ ذرا سی بوندوں سے گھبرا گئے۔ اس برتے پر تم عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے؟ ارے بخاری کی تقریروں میں تو تمہیں انگریزوں کی رائفلوں کی گولیاں بھی کھانی پڑیں گی اور تم ہو کہ ان دو چار بوندوں ہی سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ یاد رکھنا اگر بھاگ گئے تو پھر کبھی پہاڑ گنج کا منہ نہ دیکھوں گا۔ ہاں یاد آیا۔ تم بھی سچے ہو۔ جیب میں رکھے ہوئے نوٹوں کا خیال آگیا ہوگا" ان الفاظ کا شاہ جی کے منہ سے نکلنا تھا کہ لوگ دبک کر بیٹھ گئے۔ جلسے کا رنگ جم گیا۔ حتیٰ کہ چند لمحات کے بعد بارش بھی تھم گئی۔

حضرت شاہ جی کے ایک دوسرے جلسے کا ایک دلچسپ اور پرلطف واقعہ انہیں دنوں مجھے اپنے والد صاحب مرحوم کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا۔ پاکستان کے قیام سے پہلے انبالہ (مشرقی پنجاب) میں "انجمن تبلیغ اسلام" کے نام سے ایک انجمن ہوتی تھی۔ جس کے صدر میر غلام بیگ نیرنگ مرحوم تھے۔ میر صاحب اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر اور معتدل مزاج سیاست دان بھی تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک مرکزی اسمبلی میں انبالہ ڈویژن کے مسلمانوں کی بلامقابلہ نمائندگی بھی فرماتے رہے۔ انجمن تبلیغ اسلام کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محض تبلیغ دین تھا۔ سیاسیات سے غالباً اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک مرتبہ انجمن کا سالانہ جلسہ انبالے میں منعقد ہونا قرار پایا۔ میر صاحب نے ہندوستان کے جن مشاہیر علماء کرام کو اس موقع پر مدعو کیا ان میں حضرت شاہ جی بھی تھے۔ میر صاحب نے شاہ جی سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کی تقریر محض تبلیغی ہوگی۔ اور سیاست سے انہیں بہر صورت دامن بچانا ہوگا۔ لیکن شاہ جی بھلا کہاں چوکنے والے تھے۔ پھر پھرا کر آخر سیاست پر آہی گئے اور اپنی تقریر کا رخ فرنگی استعمار کے خلاف پھیر دیا۔ میر صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو کیا کہتے بس چپکے سے کرسیٔ صدارت چھوڑ کر غائب ہوگئے۔ دوران تقریر اب جو شاہ جی نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو کرسیٔ صدارت سے میر صاحب قبلہ غائب! شاہ جی مسکرائے اور فرمانے لگے "اچھا بھاگ گئے۔ اب تم صدارت کرو میرے بھائی" یہ کہہ کر اپنا موٹا سا لکڑی کا ڈنڈا کرسیٔ صدارت پر رکھ دیا۔ جس کا سامعین نے قہقہوں سے استقبال کیا۔

ملتان کا ذکر ہے مدرسہ قاسم العلوم کا سالانہ جلسہ تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ حاضرین کی کثرت سے باغ لانگے خان جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا پٹا پڑا تھا۔ جلسے کے مقررین میں حضرت شاہ جی کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اور تقاریر کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن شاہ جی ابھی تک تشریف نہ لائے تھے۔ اور لوگ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شاہ جی کی صورت نظر پڑی اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر میں شاہ جی مائیکروفون کے سامنے تشریف لائے۔ اور فرمانے لگے "ملتان والو! آج میں اپنی تقریر کا وقت ایک اور صاحب کو دے رہا ہوں جو ماشاء اللہ بہت ہی دلکش پیرائے میں تقریر فرمائیں گے" لوگوں نے یہ سنا تو چلانے لگے "نہیں شاہ جی آپ تقریر فرمائیں۔ ہم آپ کو سننا چاہتے ہیں" شاہ جی بڑے متین لہجے میں فرمانے لگے "اللہ کے بندو! اللہ کی سرزمین ابھی اس کے نیک بندوں سے خالی نہیں ہوئی عطاء

اللہ شاہ بخاری کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس دنیا میں موجود ہیں۔ جنہیں خدائے بزرگ و برتر نے قوت گویائی سے مالا مال فرمایا ہے۔ "نہیں شاہ جی آپ! پھر کچھ لوگ چلائے "نہیں نہیں" شاہ جی کے لہجے میں اب قدرے تلخی تھی۔ "آیئے حافظ صاحب تشریف لایئے"

لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج سے ایک نابینا بزرگ اٹھے اور مائیکروفون کی جانب بڑھنے لگے۔ شاہ جی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں مائیکروفون کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ بزرگ ڈیرہ غازی خان کے حافظ اللہ وسایا صاحب تھے۔ حافظ صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن حکیم کا ایک رکوع اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ تلاوت فرمایا کہ لوگ مسحور ہو گئے۔ واقعی شاہ جی نے درست فرمایا تھا۔ تلاوت کے بعد حافظ صاحب نے فضائل حدیث پر ملتانی زبان میں تقریر کا آغاز کیا۔ عجب مٹھاس، حلاوت اور شیرینی تھی انکی تقریر میں کہ مقامی مہاجر سبھی جھوم رہے تھے۔ مجھے اس روز محسوس ہوتا کہ لسانی تعصب کس قدر غیر ضروری اور بے معنی ساجذبہ ہے۔ کسی زبان کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا ہے جب ہم اس زبان کو کسی اہل زبان کی زبانی سنتے ہیں۔ زبان کوئی بھی ہو از خود بری نہیں بلکہ ہماری عصبیت اور کوتاہ نظری اسے ہمارے دل و دماغ کے سامنے بری شکل میں پیش کر دیتی ہے۔

۱۹۵۷ء کی ابتداء میں ملتان ہی کے ایک جلسے میں شاہ جی اپنی تقریر میں اس جنگ اقتدار پر تبصرہ فرما رہے تھے جو پاکستان میں وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد لڑی جا رہی تھی۔ جب چندریگر مرحوم کا ذکر آیا تو انہوں نے ایک چھوٹا سا فقرہ کہا جسے سن کر لوگ پھڑک اٹھے۔ فرمایا "ایک چلہ وہ بھی کاٹ گئے" یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ چندریگر صاحب کی وزارت عظمیٰ کی عمر قریب قریب چالیس دن ہی تھی۔

حضرت شاہ جی کا ایک یادگار واقعہ مجھے مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مرحوم مالک دوا خانہ سلیمانی جہانیاں نے بھی سنایا تھا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کے قیام کو ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ ان دنوں واہگہ کی سرحد پر دونوں ملکوں کے شہریوں میں تبادلے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اور سکھ تاجر من جملہ اور اشیاء کے نادر و نایاب اسلامی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت کر جاتے تھے۔ یہ گرانمایہ کتابیں مشرقی پنجاب کے اسلامی کتب خانوں کی متاع بے بہا تھیں۔ مشرقی پنجاب کے خونیں ہنگاموں میں ہزارہا کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔ کتنی ہی کتابوں کو دریا برد کر دیا گیا۔ قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ کے اوراق بازاروں میں روندے گئے۔ بہرحال جو کتابیں محفوظ رہ گئیں وہ اس طرح فروخت کی جا رہی تھی۔ ان بیچنے والوں کو کیا معلوم کہ یہ کس کان کے جواہر یکتا ہیں۔ اور ان کے خریدنے اور جمع کرنے والوں نے خدا جانے کس کس طرح خریدا اور جمع کیا تھا۔ انہی ایام میں ایک صاحب نے میرے لئے دو کتابیں خریدیں جن میں سے ایک مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" تھی۔ جس کی بارہ جلدیں یکجا مجلد تھیں۔ اس کتاب کو صرف پانچ روپے میں خرید اگیا تھا حالانکہ اس زمانے میں یہ بالکل نایاب تھی۔ اور سو سوا سو روپے سے کم نہیں ملتی تھی۔

دوسری کتاب "مفردات امام راغب" تھی۔ اس کتاب کا شمار بھی نہایت کمیاب کتابوں میں ہوتا تھا۔ اور یہ صرف دو روپے کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ "پیش کش من جانب محمد گل شیر بخدمت گرامی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کتاب کو مولانا محمد گل شیر شہید نے حضرت شاہ جی کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔ اور جب فسادات امرتسر میں دوسرے کتب خانوں کے ساتھ ساتھ شاہ جی کا کتب خانہ بھی لٹا تو کتابیں بکھر بکھر کر فروخت ہونے کے لئے واہگہ کی سرحد پر آ گئیں۔ مجھے جب اس کتاب کا تعلق شاہ جی کی ذات گرامی سے معلوم ہوا تو میں بے چین ہو گیا اور اگلی مرتبہ جب لاہور جانا ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ تاکہ اسے شاہ جی کے حوالے کر دوں۔ میں اس مقصد کے لئے سب سے پہلے مجلس احرار کے دفتر پہنچا جہاں ان دنوں شاہ جی تشریف فرما تھے۔ چونکہ شاہ جی اس وقت کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تاہم کتاب کو میں نے دفتر کے ایک صاحب کے سپرد کر دیا اور تاکید کی کہ اسے شاہ جی کی خدمت میں میری جانب سے پیش کر دیا جائے۔ شاہ جی کو جب کتاب ملی تو سنا ہے کہ شدت غم سے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ ملاقات ہوئی تو بڑی ممنونیت کا اظہار فرمایا اور پھر اس واقعے کا ذکر مختلف محفلوں اور متعدد تقریروں میں بطور خاص کیا۔

اس واقعے کا تحیر کن اور ناقابل فراموش پہلو یہ ہے کہ پہلی کتاب یعنی تفسیر بیان القرآن بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ملکیت تھی۔ یہ تفسیر آج بھی ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔ اور اس کے مختلف مقامات دیکھنے کا مجھے متعدد بار موقع ملا لیکن اس حقیقت کا پتہ مجھے شاہ جی کی حیات میں نہ چلا بلکہ ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد یہ بات معلوم ہوئی اور وہ یوں کہ جس مقام پر بیان القرآن کی چوتھی جلد ختم ہوتی ہے وہاں ایک گوشے میں شاہ جی نے اپنے دست مبارک سے

"احقر عباداللہ السید شرف الدین احمد المعروف بہ سید عطاء اللہ البخاری العظیم آبادی غفرلہ الباری"

تحریر فرمایا ہوا تھا۔ مجھے شاہ جی کے یہ الفاظ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ ان کی یہ علمی نشانی میرے پاس ہی رہے۔

حضرت شاہ جی حقیقی معنوں میں درویش تھے۔ ان کے فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امرتسر میں دو مکان چھوڑ کر آئے تھے لیکن انہوں نے اس جائیداد کا کوئی کلیم کسی عدالت میں پیش نہیں کیا۔ کہ جب اس جائیداد کے بدلے یہاں جائیداد مل گئی تو ہجرت کا ثواب ہی جاتا رہے گا۔ شاہ جی کا یہی کردار ایک دوسرے واقعے سے بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔

دیر کی بات ہے۔ شاہ جی ان دنوں بہاول پور میں تشریف فرما تھے۔ نواب صاحب بہاول پور کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیرہ نواب صاحب سے شاہ جی کی خدمت میں بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی۔ سیکرٹری صاحب نواب صاحب کا پیغام لے کر شاہ جی کے پاس پہنچے شاہ جی نے سنا تو فرمایا کہ

فقیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا کرتے۔ پھر ہنسے اور فرمانے لگے کہ اب تو میں ویسے بھی ان کی ریاست میں بحیثیت مہمان مقیم ہوں۔ اب یہ معزز میزبان کا کام ہے کہ وہ میزبان کی عزت و توقیر میں پیش قدمی فرمائیں۔ چنانچہ سیکرٹری صاحب واپس چلے گئے۔ اگلے دن نواب صاحب بہاول پور بہ نفس نفیس شاہ جی سے ملنے آئے اور دس ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کیا۔ شاہ جی نے اس خطیر رقم کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "فقیر کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صبح و شام دو روٹیاں مل جاتی ہیں۔ بس اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔ نواب صاحب نے اصرار کیا تو ان کی تالیف قلب کے لئے دس ہزار روپوں میں سے صرف دس روپے اٹھا لئے۔

ایسا جاں باز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے؟

ایسا غم خوار مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے — کھو گیا واقفِ قرآن کہاں ڈھونڈیں گے
"بے خطر آتش نمرود میں" جو "کود پڑے" — ایسا ملت کا نگہبان کہاں ڈھونڈیں گے
فیصلے دل کے نگاہوں سے کئے ہوں جس نے — ایسا درویش مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے
جس کی للکار سے لرزاں تھے سگانِ باطل — ختم مرسل کا وہ دربان کہاں ڈھونڈیں گے
کل ہمیں سنت یوسف کی ضرورت ہو گی — ہائے وہ واقف زندان کہاں ڈھونڈیں گے
جذبۂ موت بھی ہے دار و رسن بھی لیکن — جان منصور کی پہچان کہاں ڈھونڈیں گے
سطوت شاہ سے مرعوب نہ ہونے والا — کتنا بے باک تھا انسان کہاں ڈھونڈیں گے

پاسباں ملک کا اور شریعت کا امیر
ایسا جانباز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جانباز مرزا مرحوم